> نہیں جانتے۔ بڑی دستاویز ان کی یہ ہے کہ زبان اس کی کج مج ہے... نہیں جانتے کہ... معنی جان سخن آب دار، اور لفظ اس کا لباس مستعار ہے۔
> ... جسے سخن سنجی اور شعر فہمی میں خوب راہ... ہے... اس پر واجب و لازم ہے کہ... کلیات سودا کو بغور نظر ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان سبھوں کو یک داستان "گلشن [عشق"] یا "علی نامہ" سے مقابلہ دیوے... سودا کو چھوڑ دیوے جس شاعر فارسی گو سے چاہے، خواہ قصائد میں، خواہ مثنوی میں، اسے موازنہ میں لاوے۔(۴۱)

باقر آگاہ کا یہ خیال شاید درست نہ ہو، کہ "معنی" دراصل "جان سخن" ہے، اور لفظ کچھ نہیں، محض اس کا لباس ہیں۔ لیکن نظریۂ شرح، اور فلسفہ ترجمہ کی بہت سی باریک بحثیں اس کی پشت پناہی میں ہیں۔ شیخ جرجانی نے بھی اس مسئلے پر کلام کیا ہے، کہ آیا کسی متن کا ترجمہ اس کے معنی کو صحت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر الفاظ کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے؟ یعنی کیا معنی قائم بالذات ہیں، اور الفاظ کی حیثیت ایک ظرف سے زیادہ نہیں جس میں معنی کا مظروف ڈالا جاتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اسلوب، طرز ادا، یہ سب ثانوی اور ضمنی اشیا ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے پر تفحص کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ لیکن یہاں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ باقر آگاہ کو لفظ اور معنی کے نظری نکات پر دستگاہ تھی، اور ان کی ذہنیت غلامانہ نہیں تھی۔ وہ اہل شمال کے سامنے اپنی مخالفانہ رائے رکھتے تھے، اور اپنے شعرا کو مستند قرار دینے کے لیے وہ شمال کی فہرست استناد کے محتاج نہ تھے۔

باقر آگاہ کے احتجاج کے باوجود دہلی والوں کا تعصب، جس کا آغاز میر نے کیا تھا، بڑھتا ہی گیا۔ اور شمال میں آج بھی ایسے لوگ کم ہوں گے جو نصرتی کو اردو کے عظیم ترین شعرا میں اس کا مقام دلانے پر اصرار کریں۔

(۴۱) علیم صبا نویدی نے باقر آگاہ کی کچھ تحریریں "مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر" (مطبوعہ چنئے [مدراس]، تامل ناڈ اردو پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) کے نام سے شائع کی ہیں۔ ملاحظہ ہوں ص ص ۱۴۴ تا ۱۴۶۔

باب پنجم

وقفے، اور پھر حقیقی آغاز، شمال میں

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں بھی گجری میں ادبی سرگرمیاں ترقی پذیر رہیں۔ یہ دکن سے الگ، لیکن دکن سے بالکل غیر متعلق نہیں تھیں۔ گذشتہ صفحات میں ہم "تاریخ غریبی" (۱۷۵۱/۱۷۵۷) کا ذکر پڑھ چکے ہیں کہ "ہندی" کے استعمال کی حمایت اس مثنوی میں بڑے زور شور سے کی گئی ہے۔ اٹھارویں صدی کا وسط آتے آتے عبدالولی عزلت (۱۶۹۲/۱۶۹۳ تا ۱۷۷۵) کی دیو قامت شخصیت جسمانی اور دانشورانہ، دونوں طرح سے سارے برصغیر پر اپنا نقش بٹھا چکی تھی۔ جسمانی میں نے اس لیے کہا کہ عزلت نے پہلے تو سورت سے دہلی نقل مکانی کیا، وہاں سے وہ مرشد آباد جا کر مہابت جنگ سے متوسل ہوئے۔ پھر وہ خاص دکن کو چلے گئے۔ بقول میر، وہ مثل آب ہر رنگ میں شامل تھے۔ دانشورانہ طور پر اس لیے کہ ان کا کلام ولی سے تسلسل قائم کرتا ہے، اور اس طرح دکنی اور ریختہ کو نزدیک لاتا ہے۔ بعد کے شعرا، حتیٰ کہ خود میر، نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اپنے دیوان اردو (۱۷۵۸/۱۷۵۹) کا دیباچہ عزلت نے اردو میں لکھا، اور یہ اپنی طرح کی اردو نثر میں پہلی تحریر ہے۔

اس زمانے کے آس پاس شمال میں کئی طرح کی نثر نے جھجکتے ہوئے سر نکالا۔ ان میں سب سے قدیم تو "کربل کتھا" ہے، جو فارسی سے ترجمہ ہے، مگر بہت آزاد قسم کا۔ اس کے مصنف / مترجم فضل علی فضلی کے بارے میں یہی معلوم ہے کہ وہ دہلی کے تھے، اور انھوں نے "کربل کتھا" کو ۱۷۳۲ کے آس پاس لکھا، اور ممکن ہے آئندہ برسوں میں وہ اس میں حک و اضافہ بھی کرتے گئے ہوں۔ اس کے بعد "عیسوی خاں بہادر" کا داستان نما "قصۂ مہر افروز و دلبر" ہے۔ یہ عیسوی خاں بہادر کون اور کیا تھے، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا

ہے۔ لیکن "قصہ مہر افروز و دلبر" کی تاریخ ۱۷۳۱ اور ۱۷۵۵ کے درمیان متعین کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ہری ہر پرشاد سنبھلی (زمانہ، ۱۷۳۰ کے آس پاس)، اور بندرا بن متھراوی (وفات ۱۷۵۷) ہیں جن کی ایک دو تاریخی تصانیف معلوم ہیں۔ سودا (۱۷۰۶؟ تا ۱۷۸۱) نے اپنی مثنوی "سبیل ہدایت" میں چند صفحات کی عبارت اردو میں لکھی۔ حسین عطا تحسین کی داستانی تصنیف "نو طرز مرصع" (۱۷۷۵) اٹھارویں صدی کی دہلوی اردو نثر کا تیسرا سب سے مبسوط، اور موجود، نمونہ کہی جا سکتی ہے۔

عبدالولی عزلت کی وفات کے وقت تک دہلی کا محاورۂ ریختہ کم و بیش پوری اردو دنیا میں رائج ہو چکا تھا، اور گجری کی علیحدہ روایت کا اختتام بھی اٹھارویں صدی کی آخری چوتھائی میں قرار دیا جا سکتا ہے۔ عزلت اگرچہ سورت نژاد تھے، لیکن انھوں نے اپنی زبان کو "ہندی" بتایا ہے(۱)۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ "تاریخ غریبی" (جس کی تاریخ تقریباً وہی ہے جو عزلت کے دیوان کی ہے) میں بھی زبان کا نام "ہندی" ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارا پرانا سوال اب پھر اٹھتا ہے کہ اٹھارویں صدی کی دہلی میں اردو ادب کے موافق کیا خاص بات پیدا ہو گئی جو پہلے نہ تھی؟ کیا وجہ ہے کہ مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ تا ۱۱۲۱) سے خسرو (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵) کے درمیان اردو میں ادبی زندگی خاموش رہی، اور پھر خسرو کے فوراً بعد دوسرا "دور سکوت" شروع ہوا، جس کا اختتام ڈیڑھ دو سو برس بعد پندرہویں صدی کے گجرات میں ہوا؟ اور اردو ادب کا گجرات سے دہلی واپس آنا بھی کوئی دو سو برس بعد ہی کیوں ممکن ہو سکا؟ میرا خیال ہے کہ اب ہم ان سوالوں کے جواب دینے کی حیثیت میں ہیں۔ ہمارے جوابات کو حسب ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) گجرات میں، اور پھر جلد ہی دکن میں، صوفیوں نے ہماری زبان کو اپنایا۔ اس کے پہلے اس زبان کی کوئی ادبی حیثیت نہ تھی۔ (گجرات کے بارے میں تاریخی صورت حال کی مزید وضاحت نیچے آتی ہے)۔

(۲) مسعود سعد سلمان، اور بعدہٗ خسرو نے "ہندی / ہندوی" میں جو لکھا، وہ محض ضمنی اور ذیلی تحریروں کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی مستقل، یا تازہ تازہ وجود میں آتی ہوئی روایت نہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی "ہندوی / ہندی اسلوب" متعین ہو سکا تھا۔

(۳) چودہویں صدی کی اودھی میں ادبی کارگزاری (ملا داؤد کی "چندائن"،

(۱) جمیل جالبی، "تاریخ"، جلد دوم، حصہ دوم، ص ص ۱۰۰۶ تا ۱۰۰۷۔

۱۳۷۹) کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ "ہندی / ہندوی" اس وقت تک ادبی زبان نہ بنی تھی، ورنہ اغلب ہے کہ ملا داؤد اسے ہی اختیار کرتے۔ ان کے وقت میں تو صورت یہ ہے کہ وہ اپنی اودھی کو ہی "ہندی" (یعنی دریاے نربدا کے اوپر والے علاقے کی زبان) کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی نظر میں ہماری "ہندوی / ہندی" کا وجود شاید نہ تھا۔

(۴) اردو کی قدیم ترین ادبی تحریریں گجرات، اور پھر خاص دکن میں وجود میں آئیں، اور ایک کے سوا سب صوفیانہ ہیں۔

(۵) چونکہ صوفی لوگوں کے مخاطبین میں ان کے ماننے والے، مرید اور معتقد کثیر تعداد میں ہوتے تھے، لہٰذا یہ فطری تھا کہ صوفیا کے مریدین اپنے مرشد کے اقوال اور متون کو خاص اہتمام سے محفوظ کر لیتے تھے۔

(۶) شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۵ تا ۱۵۳۸) اور سنت کبیر (وفات ۱۵۱۸) کے پہلے کسی صوفی نے "ہندی / ہندوی" کو شمال میں ادبی اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ لیکن شیخ گنگوہی، اور نہ ہی سنت کبیر نے اس خالص کھڑی میں لکھا جو ترقی کر کے آج کی اردو بنی۔ شیخ گنگوہی کی زبان میں برج حاوی ہے۔ اور کبیر کی زبان میں اودھی اور بھوجپوری کے عناصر نمایاں ہیں۔ اس سے اہم تر بات یہ کہ دونوں ہی دہلی سے دور تھے، اور دہلی ہی ان کے زمانے میں ہند+مسلم تہذیب کا دارالخلافت تھی۔

(۷) لہٰذا شمالی ہند کے ادب میں "ہندی / ہندوی" کے اس قدر تاخیر سے وارد ہونے کی وجہ اس بات میں ہے کہ شمالی ہند کے صوفیا نے اس زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنانے میں بہت تاخیر کی۔

(۸) اس تاخیر کی واحد وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس زمانے میں دہلی، پنجاب، اور قریبی علاقوں میں فارسی کو عوامی زبان نہیں تو لنگوا فرانکا کی حیثیت ضرور حاصل تھی۔ ہم ایران و ترکستان وغیرہ کے تازہ وارد علما کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ انھوں نے فلاں شہر کی جامع مسجد میں وعظ کہا۔ ظاہر ہے کہ یہ مواعظ فارسی ہی میں ہوتے ہوں گے۔ چونکہ فارسی کے سمجھنے والے مقامی طور پر کثیر

تعداد میں موجود تھے، اس لیے اس زمانے کے صوفیا کو دہلی اور شمال کے دیگر علاقوں میں کسی اور زبان کی ضرورت نہ تھی۔ یہ صورت حال پندرہویں صدی کے گجرات میں تھی اور نہ دکن میں۔ لہٰذا وہاں پہنچ کر صوفیوں نے "ہندی / ہندوی"، یعنی ان لوگوں کی زبان استعمال کی، جو دہلی اور دیگر علاقوں سے وہاں آئے تھے، اور وہ عام طور پر کم پڑھے لکھے، اور دہلی سے دور تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان میں تغیر بھی ہوا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اسے وقتاً فوقتاً "دہلوی"، "ہندی"، "ہندوی"، "گجری / گوجری"، "دکنی" وغیرہ کے نام سے پکارا گیا۔

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ، کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ستیش چندر مشرا نے ازمنۂ وسطیٰ کے گجرات پر بہت کام کیا ہے، اور گجری کے بعض ادبی متون کو انھوں نے مدون بھی کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے گجری کا وجود شمالی ہند میں "اردو" کے آغاز کے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ یہ دعویٰ زیادہ وثوق انگیز نہیں، کیوں کہ "گجری" بطور اسم زبان کے بہت پہلے "ہندی / ہندوی / دہلوی" اسم زبان کے طور پر وجود میں آ چکے تھے۔ لیکن ان کی یہ بات قابل لحاظ ہے کہ :

> وہ تارکین وطن جو زیادہ تر سندھ، پنجاب، اور گنگا کی وادی سے آکر گجرات میں بس گئے تھے، ان کے باعث [وہ زبان وجود میں آئی جسے] شروع شروع میں گجری کہا گیا۔ اس میں کوئی چھ سات زبانوں کی لفظیات شامل تھی... اس زبان کو احمد آباد میں سلطان اور اس کے درباری [عدالت میں ؟] استعمال کرتے تھے۔ یہ کھمبات، ویراول، اور راندیر کی ساحلی دکانوں اور بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ اسے صوفیا اور دیگر مسلمان واعظین استعمال کرتے تھے... اور بالآخر، یہ تارکین وطن کے ان جم ہائے غفیر کی زبان بنی جو علاء الدین خلجی کے ساتھ [۱۲۹۷]، اور بعد کی لہروں کے ساتھ گجرات آئے...
>
> اس طرح، جہاں فارسی رسومیاتی اور سرکاری بات چیت کے لیے مقبول تھی، وہاں غیر رسومیاتی مواقع کے لیے گجری مقبول عام زبان بن گئی... سولہویں

> صدی کے ختم ہوتے ہوتے گجری، گجرات کے دور و نزدیک میں سمجھی جانے والی لنگوا فرانکا بن چکی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا ایک خاصا بڑا طبقہ اسے پہلی زبان کے طور پر بولتا تھا۔(۲)

قبل ۱۲۹۷ کے گجرات کی مذکورہ بالا لسانی / تاریخی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس امر پر ہمیں کچھ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جہاں شمال کے صوفیا بھی اپنے ادبی اور مواعظی کلام کے لیے فارسی ہی کو بکار لا رہے تھے، وہاں گجرات کے صوفیا نے سولہویں صدی کے آتے آتے "ہندی / گجری" کو ادبی زبان کا مرتبہ عطا کر دیا تھا۔

شمالی ہند میں ہندی / ہندوی کی قدیم ترین یادگار جو ہم تک پہنچی ہے، محمد افضل کی مثنوی "بکٹ کہانی" (۱۶۲۵) ہے۔ تین سو پچیس شعر کی یہ مثنوی ہر لحاظ سے ایک بڑا کارنامہ کہی جانے کی مستحق ہے۔ یہاں اس کے تفصیلی محاکے کا موقع نہیں۔ اتنا ضرور کہا جانا چاہیے کہ محمد افضل (جنھیں افضل گوپال بھی کہا گیا ہے)، اگرچہ غالباً صوفی نہ تھے، لیکن ان کے عشق کی داستان، اگر وہ صحیح نہیں بھی ہے، اور موضوعی ہے، تو بھی وہ اپنی شدت جذبہ، اور وفور شوق اور انجام کے لحاظ سے وہی کیفیت رکھتی ہے جو صوفیانہ / عشقیہ مثنویوں (مثلاً شیخ احمد کی "یوسف زلیخا"، اور ملا داؤد کی "چندائن") میں نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ "بکٹ کہانی" ۱۶۲۵ سے پہلے کی ہو، لیکن ہمارے پاس اس کے بارے میں یہی تاریخ ہے، اور وہی محمد افضل کی تاریخ وفات بھی ہے۔ "بکٹ کہانی" مذہبی یا صوفیانہ کلام نہیں، اور یہ بجائے خود بڑی دلچسپ بات ہے کہ شمال میں اردو کا پہلا کارنامہ جو ہم تک پہنچا ہے، وہ مذہبی / صوفیانہ نہیں ہے، اگرچہ اس میں کیفیت صوفیانہ کلام کی ہے۔ شمال میں ہم آئندہ بھی یہی دیکھیں گے کہ اٹھارویں صدی سے اردو کی ادبی پیداوار پر غیر مذہبی / غیر صوفیانہ رنگ حاوی ہے۔

"بکٹ کہانی" کے بہت بعد، لیکن سترہویں ہی صدی میں شمالی ہند میں بھی "ہندی / ہندوی / ریختہ" کے بعض کارنامے نظر آتے ہیں۔ ان کی ادبی حیثیت معمولی ہے، لیکن ان کا مزاج مذہبی ہے۔ یہ سب تصانیف سترہویں صدی کے ربع آخر کی ہیں۔ ان کا مذہبی (اگرچہ غیر صوفیانہ) مزاج اس خیال کی تصدیق

---

(۲) منشی سید عباس علی: "قصۂ غم گین" (اصل نام "جنگ غمگین")، مرتبہ ستیش چندر مشرا، بڑودہ، مہا راجا سیاجی یونیورسٹی ۱۹۷۵، ص ص ۲۱ تا ۲۲۔ اس کتاب کی طرف متوجہ کرنے کے لیے میں بڑودہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ تاریخ، پروفیسر سوشیل سری واستوا کا ممنون ہوں۔

کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان میں ادب کی پیداوار شروع ہونے کے لیے کسی قسم کے مذہبی جذبے کی تحریک شاید ہمیشہ ہی ضروری رہی ہے۔ اگر صوفیوں نے شمال کی زبان کو تیرہویں صدی ہی میں اپنے مواعظ وغیرہ کے لیے برتنا شروع کر دیا ہوتا تو اردو کی ادبی تاریخ کا افق جہاں آج ہے اس سے بہت پیچھے ہوتا۔

روشن علی نے اپنا طویل منظوم "جنگ نامہ" یا "عاشور نامہ" ١٦٨٨/١٦٨٩ میں لکھا۔ اسمٰعیل امروہوی نے اپنی مثنوی "وفات نامۂ بی بی فاطمہ" ١٦٩٣/١٦٩٤ میں تصنیف کی۔ ان دونوں متون میں "عوامی مذہبیاتی" رنگ غالب ہے۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ روشن علی کا "جنگ نامہ" گجری کے ایک جنگ نامے "جنگ نامۂ محمد حنیف" مصنفہ مسکین سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مسکین کے جنگ نامے کی تاریخ ظہیر الدین مدنی نے ١٦٨١ قرار دی ہے۔(٣) اس قرب زمانی سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ روشن علی نے مسکین کا اثر قبول کیا ہو۔ (ملحوظ رہے کہ "جنگ نامۂ محمد حنیف" نام کی ایک نظم آج بھی شمالی ہند میں مقبول ہے)۔ اگر مسکین کی نظم روشن علی کے جنگ نامے پر اثر انداز ہوئی ہے، (جس کا قوی امکان ہے) تو یہ نتیجہ ناگزیر ہے کہ اس زمانے میں شمال و گجرات میں ادبی سطح پر روابط موجود تھے، اور ان کی نوعیت فوری تھی۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ گجرات یا شمال کی تصنیف کی خبر فریق ثانی کو بہت دیر میں ملتی ہو۔

مسکین نے اپنی زبان کو "گجری" کہا ہے۔ روشن علی اپنی زبان کو مختلف موقعوں پر "ہندی"، "ہندوستانی"، اور "ہندوی" بتاتے ہیں۔(٤) اگر روشن علی نے مسکین کی تقلید کی، اور اس کے باوجود اپنی زبان کو "ہندی / ہندوستانی / ہندوی" کہا، تو ہم یہ نتیجہ بھی نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ روشن علی کی نظر میں ان کی لسانی روایت گجری سے مختلف تھی۔

شمالی ہند کے اردو ادب میں پہلا غیر صوفی نام محمد افضل کا ہے۔ اور وہی اس وقت شمال میں اردو ادب کا پہلا نام بھی ہے۔ لیکن افضل (وفات ١٦٢٥) اور جعفر زٹلی (١٦٥٩؟ تا ١٧١٣) کے درمیان ہماری آج کی اطلاع کے مطابق کوئی بھی نہیں۔ اور جعفر زٹلی کی ادبی شخصیت کو دہلی کے منظر میں قائم ہوتے ہوتے وقت کا دھارا سترہویں صدی سے بہہ کر اٹھارویں صدی میں ضم ہونے کے قریب آ چکا تھا۔ اس طرح ان کے درمیان تقریباً ایک پوری صدی ہے، لیکن نہ تو افضل، اور نہ جعفر کے کلام سے اس غیر معمولی نمو اور بہار کا اندازہ ہوتا ہے جو چند ہی برس میں دہلی کی پوری تہذیب پر چھانے والی تھی۔ اور پھر یہ بہار اور یہ افزائش اگلی

(٣) ظہیر الدین مدنی، "گجری مثنویاں"، ص ص ١٥ نیز ٢٥ تا ٢٦۔

(٤) جمیل جالبی، "تاریخ"، جلد دوم، ص ٧٤۔

ڈیڑھ صدیوں تک بے روک ٹوک قائم رہی۔ جنگ، بیرونی حملے، داخلی تفرقہ و فساد، سیاسی انتشار، اور تسلط غیر نے اس قوت نمو پر کچھ اثر نہ کیا۔ اور اس کے باوجود اردو ادب اور تہذیب کے "سرکاری" مورخوں کی نظر میں یہ سارا دور انحطاط، اور اخلاقی اور تہذیبی زوال سے عبارت تھا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (١٨٩٣ تا ١٩٧٥) کے کتب خانے میں اٹھارویں صدی کی ایک بیاض کے دو نسخے تھے۔ یہ بیاض رثائی نظموں پر مشتمل تھی، اور چونکہ دونوں نسخوں میں مماثلت بہت قریب کی تھی، لہٰذا بقول مسعود حسن رضوی ادیب، بیاض کے "ایک سے زائد نسخوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ کسی شخص کی نجی بیاض نہیں ہے، بلکہ مستقل کتاب ہے جس کا کچھ نام بھی ضرور ہوگا"۔ اغلب ہے کہ اس بیاض / کتاب کی متعدد نقلیں لوگوں کے پاس رہی ہوں گی، اور اس میں مندرج کلام کو مناسب موقعوں پر پڑھا، یا گایا جاتا ہوگا۔ ایک نسخہ، جو کامل ہے، اس کا ترقیمہ فارسی میں ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

> یہ بیاض سہ شنبہ کے دن، بتاریخ ١١ ربیع الثانی ٢٠ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی، فقیر حقیر محمد مراد کی تحریر میں مکمل ہوئی۔(٥)

ہجری تاریخ سے جدید تاریخ ١٨ جولائی ١٧٢٧ حاصل ہوتی ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں کہ "ان مرثیوں کی زبان کا... میر جعفر کی زبان سے مقابلہ کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ مرثیہ گو میر جعفر سے قدیم تر ہیں، اور غالباً گیارہویں صدی ہجری اور سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر [اول؟] میں گذرے ہیں۔ ان کے مرثیے شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں ہیں۔"(٦)

اس بیاض کے مشمولات کی ادبی حیثیت تو کچھ خاص نہیں، لیکن مورخ ادب کے لیے یہ انمول ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسعود حسن رضوی ادیب نے بیاض کے تمام مشمولات کی تاریخ سترہویں صدی کے نصف دوم کا آغاز قرار دے کر تھوڑی امید پرستی سے کام لیا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بیاض کے اکثر مشمولات ١٦٥٠ اور ١٦٧٥ کے زمانے کے ہیں، اور "بکٹ کہانی"، روشن علی، اور میر جعفر زٹلی کے

(٥) سید مسعود حسن رضوی ادیب: "شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں"، مرتبہ اظہر مسعود، لکھنؤ، کتاب نگر، ١٩٨٤، ص ص ١٧ تا ١٨۔

(٦) مسعود حسن رضوی ادیب، "شمالی ہند..."، ص ٢٥۔ چونکہ سترہویں صدی کا نصف دوم اور زٹلی کا زمانۂ حیات تقریباً ایک ہیں، اس لیے اغلب ہے کہ یہاں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے سہواً "نصف اول" کی جگہ "نصف دوم" لکھ دیا۔ یا ممکن ہے سہو کاتب ہو۔

درمیان تسلسل پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ ہندی / ہندوی میں ادبی پیداوار کی اولین فصلیں صوفیوں نے گجرات اور دکن دونوں علاقوں میں بوئیں، تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ پھر شمال میں ایسا کیوں نہ ہوا؟ اوپر میں نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ اس زمانے میں شمال کے صوفیوں کے مخاطبین کے لیے فارسی کوئی اجنبی زبان نہ تھی، بلکہ عام طور پر سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا صوفیا کو فارسی ترک کرنے اور ہندی اختیار کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ صوفیوں نے ہندی / ہندوی کو اس لیے نہ اختیار کیا ہوگا کہ اس زمانے میں یہ زبان کچھ باعزت نہ تھی۔ صوفیوں کو دنیاوی عزت داری سے کوئی غرض تھی اور نہ وہ اس کا احترام ہی کرتے تھے۔ اگر انھیں اپنی بات کہنے کے لیے ہندی / ہندوی کی ضرورت ہوتی تو وہ بے تکلف اسے اسی طرح اختیار کرتے جس طرح انھوں اودھ اور پورب میں وہاں کی مقامی زبانوں کو اختیار کیا تھا۔ اور پھر یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اگر گجرات اور دکن میں ہندی / ہندوی / گجری / دکنی کو عزت نصیب ہوئی تو اس کا باعث بھی صوفیا ہی کا عمل تھا کہ وہ اس زبان کو اپنی تعلیمات و افکار کے لیے بکار لائے۔

اس بات کا پورا پورا امکان ہے کہ چودھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے شمال کے بڑے حصے میں فارسی اگر روانی سے بولی نہیں جا رہی تھی تو بہ آسانی سمجھی ضرور جا رہی تھی۔ اور اس کے بولنے / سمجھنے والے، شہروں اور تحت شہری علاقوں کے لاتعداد لوگ رہے ہوں گے۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے میں افواج، اور سرکاری عملہ و فعلہ، اور تجارت کی دنیا میں فارسی کے چلن کا ہاتھ بے شک رہا ہوگا۔ جب سترہویں صدی کے کلکتہ میں پرتگالی جیسی زبان کچھ عرصے کے لیے بازار کی لنگوا فرانکا بن سکتی ہے، صرف اس باعث کہ اس عہد میں کلکتہ اور اس کے اطراف کی تجارت بڑی حد تک پرتگالی تجار اور مشنریوں کے ہاتھ میں تھی، تو پھر فارسی کے ساتھ یہ معاملہ کیوں نہیں ہو سکتا، خاص کر جب شمالی ہند میں فارسی کی موجودگی بنگال میں پرتگالی کے مقابلے میں کہیں زیادہ قدیم تھی، اور شمال کی مقامی زبانوں اور فارسی میں (سنسکرت کے باعث) ایک ربط بھی ہے؟ دور کیوں جایئے، موجودہ صدی کے وسط تک صرف دو ڈھائی سو برس کے محدود ربط کے باعث مدراس شہر اور اس کے ذیلی بڑے شہروں میں سارے اہل حرفہ، حتیٰ کہ بازار کے موچی اور حمال بھی انگریزی بخوبی سمجھتے اور تھوڑی بہت بول لیتے تھے۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں تو پھر بھی ایک ربط ہے، تامل اور انگریزی، پرتگالی اور بنگالی میں ربط کا پتا دور دور تک نہیں۔ اور چودھویں صدی کے شمالی ہندوستان میں فارسی کی موجودگی کم سے کم تین سو سال پرانی تھی۔ پھر شمالی ہند میں فارسی کا لنگوا فرانکا بن جانا کون سی تعجب کی بات ہے؟

ہندی / ہندوی کی اوائلی صدیوں میں اس زبان اور فارسی کے درمیان لین دین اور باہمی اثر پذیری کی وسعت کا اندازہ ابھی ہم لوگوں نے پوری طرح لگایا نہیں ہے۔ جہاں اس بات میں شک نہیں کہ فارسی نے ہماری زبان کو بہت کچھ دیا، وہاں یہ بھی ہے کہ یہ سارا سفر یک طرفہ ہرگز نہیں رہا ہے۔ اوپر ہم فضل الدین قوام بلخی کے لغت "بحر الفضائل" (۱۴۳۳/۱۴۳۴) کا ذکر دیکھ چکے ہیں کہ اس فارسی لغت میں ایسے ہندوی الفاظ درج ہیں جو فارسی شعر میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں فارسی لغت نویسی کا کام بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت تک کی دریافتوں کے مطابق فارسی کا دوسرا قدیم ترین لغت ("فرہنگ قواس") فخر الدین قواس غزنوی نے دہلی میں علاء الدین خلجی کے عہد (۱۲۹۶ تا ۱۳۱۶) میں تیار کیا۔ اس کے بعد ہندوستانی لغات میں محمد بن ہندو شاہ کا "صحاح الفرس" (۱۳۲۷) ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے جلد ہی آنے والوں میں حاجب خیرات دہلوی کا "دستور الافاضل" (۱۳۴۲)، قاضی بدر الدین دہلوی کا "اداۃ الفضلاء" (۱۴۱۹)، بدر ابراہیم کی "زفان گویا" (۱۴۳۳/۱۴۳۴)، اور ابراہیم قوام فاروقی کی "شرف نامۂ منیری" (۱۴۷۵) قابل ذکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اور بھی لغات رہے ہوں گے۔ ان سب میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ہندی / ہندوی الفاظ کہیں کہیں صراحت معنی کے لیے، اور کہیں لغت کے طور پر بھی درج ہیں۔(۷)

غیر معمولی وسعت اور عمق کے حامل فارسی لغات ہندوستان میں انیسویں صدی کے اواخر تک بھی لکھے جاتے رہے۔ ان کی تفصیل میں جائے بغیر اتنا کہنا کافی ہے کہ متذکرہ بالا سارے لغات ہندوستانی قاری اور طالب علم کے لیے بنائے گئے تھے، لیکن ان کا معیار ایسا ہے کہ وہ اپنے استفادہ کرنے والوں سے اعلیٰ درجے کی علمی اور لسانی مہارت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ صورت حال خاص کر ان لغات میں نظر آتی ہے جو سولہویں صدی سے مرتب ہونا شروع ہوئے۔ مثال کے طور پر صرف ایک "دستور الافاضل" (۱۵۱۹) مصنفہ مولوی محمد لاد کا ذکر کافی ہے۔ اس فرہنگ میں لغات کو عربی، ترکی، اور فارسی عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ لغات کی اصل کے بارے میں جگہ جگہ اشارے اس پر مزید ہیں، اور "ہندی" الفاظ تو ہیں ہی۔(۸)

چودھویں اور پندرہویں صدی کے ہندوستان میں لغت نویسی کے اس پھیلاؤ، مقبولیت، اور خوبی کی

---

(۷) یہ سب لغات کچھ عرصہ پہلے تک غیر مطبوعہ یا کم یاب تھے۔ اب پروفیسر نذیر احمد کی تدوین / کوشش سے اکثر شائع ہو چکے ہیں۔

(۸) مولوی محمد لاد: "دستور الافاضل"، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۸۹۹۔

روشنی میں دو نتائج یقیناً نکل سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں "ہندی / ہندوی" الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ "ہندی / ہندوی" کا نفوذ فارسی میں ہو رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ لغات اس لیے لکھے جا رہے تھے کہ ان کی ضرورت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ضرورت اس لیے تھی کہ لوگ کثیر تعداد میں فارسی سیکھ رہے تھے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سولہویں صدی کے وسط کے بعد سے ہندوستان میں فارسی لغت نگاری کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ لیکن جو لغات ۱۶۰۰ کے بعد لکھے گئے ان کا معیار گذشتہ لغات کے مقابلے میں بلند قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سترہویں صدی میں ایسے ہندوستانیوں کی تعداد بڑھنے لگی جو فارسی کے "ماہر" پڑھنے والے تھے۔ ان کے لیے پرانی لسانی اور لغاتی کتب زیادہ کار آمد نہ تھیں، جو زیادہ تر ان لوگوں کے لیے تھیں جو یوں تو شائستہ اور اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے، لیکن فارسی میں نسبتاً مبتدی تھے۔

سولہویں صدی میں "ہندی / فارسی" فرہنگیں پہلی بار سامنے آتی ہیں۔ حکیم یوسفی (زمانہ ۱۴۹۰ تا ۱۵۳۰) نے ایک قصیدہ لکھا جس میں انھوں نے "ہندی" کے الفاظ و مصادر کے معنی فارسی میں درج کیے۔ اجے چند بھٹناگر نے ۱۵۵۱ میں "خالق باری" کے طرز پر ایک منظوم فرہنگ لکھی اور اس کا نام "مثل خالق باری" رکھا۔ یہ تصانیف اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ جس طرح گذشتہ صدیوں میں غیر فارسی داں لوگ فارسی سیکھ رہے تھے، اسی طرح سولہویں صدی سے فارسی والے "ہندی" کی طرف بھی مائل ہونے لگے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً سترہویں صدی تک صورت حال یہ تھی کہ جو لوگ "ہندی / ہندوی" ادب پیدا کرنے یا پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، یا وہ لوگ جو صوفیا کے اقوال و ملفوظات، اور دیگر تحریریں پڑھنے کے شائق تھے، ان کی اکثریت کو فارسی خاصی اچھی آتی تھی۔ اس لیے وہ اپنے ادبی یا صوفیانہ شوق پورے کرنے کی خاطر کسی مقامی زبان کا سہارا لینے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اور اگر دہلی کے شمال مغرب یا جنوب مشرق میں کسی کو اودھی یا برج سے شغف تھا، تو اس کے لیے ان زبانوں کے متون موجود تھے۔

یہ بات، کہ سولہویں صدی تک شمال کے زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ فارسی کو تقریباً پہلی زبان کی طرح استعمال کرتے ہوں گے، اس طرح بھی ثابت ہے کہ یہاں جب "ہندی / ہندوی" میں ادب لکھا جانے لگا تو سب سے پہلے اس زبان میں، جسے "ریختہ" کا نام ملا۔ (واضح رہے کہ گجرات اور اوائلی دکن میں "ریختہ" کا پتا نہیں۔ یہ شمال کی چیز ہے۔) پہلے پہل تو اس کلام کو "ریختہ" کہا گیا جو فارسی / ہندی ملی جلی زبان میں لکھا جاتا تھا۔ بعدہٗ وہ زبان بھی ریختہ کہلائی جس میں وہ کلام بنایا جاتا تھا۔ پھر ہر وہ کلام جسے ریختہ میں لکھا جائے، ریختہ کہلانے لگا۔ لفظ "ریختہ" سے ایک صنف شعر مراد لینے، یا "زبان ریختہ" میں کہے ہوئے کلام کے لیے "ریختہ" کا لفظ استعمال کرنے کی مثال انیسویں صدی کے وسط تک ملتی ہے۔ اسی طرح، اسم زبان کے طور پر

"ریختہ" اور "ہندی" دونوں ہی انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک رائج رہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، "ریختہ" کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً (۱) ملا جلا، (۲) گارے اور چونے کا مسالہ جو عمارت بنانے کے کام آتا ہے، (۳) پڑا گرا، (۴) کوئی چیز جو کسی اور چیز میں ڈھالی جائے، وغیرہ۔ لہٰذا "ریختہ" وہ زبان ٹھہری جس میں فارسی کے تنے پر "ہندی" کی شاخیں لگائی جائیں، یا پھر جس میں "ہندی" کے تنے پر فارسی کی شاخیں لگائی جائیں۔ شمال کی قدیم اردو نظمیں، حتیٰ کہ "بکٹ کہانی" جیسی اعلیٰ ادبی تخلیق بھی، ریختہ ہی کے طرز میں ہیں۔ اس میں ۳۲۵ شعر ہیں۔ اکتالیس تو سیدھے سیدھے فارسی میں ہیں، اور کم سے کم بیس میں نیم فارسی اور نیم اردو مصرعے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی دریافت کردہ بیاض میں جو کلام ہے، اس کا بھی یہی حال ہے۔

ریختہ کی نوعیت واضح کرنے کے لیے مثالوں کی ضرورت شاید نہ ہو، لیکن دونوں صورتوں کی الگ الگ وضاحت غالباً کار آمد ہوگی۔ مندرجہ ذیل میں فارسی کے تنے پر "ہندی" کی شاخیں ہیں۔ اشعار صلاح، منقول از بیاض ادیب:

شاہ کا احوال پرسیدند سب اہل حرم
اس حقیقت کے بیاں سوں ماند حیراں ذوالجناح
زین خالی دیدہ خویش و اقربا رونے لگے
متفق تھا در عزا با آں غریباں ذوالجناح
دم بہ دم می زد سر خود اس الم سوں بر زمیں
زانکہ تھا از زندگی خود پشیماں ذوالجناح (۹)

اور مندرجہ ذیل میں ہندی کے تنے پر فارسی کی شاخیں ہیں۔ اشعار صلاح، منقول از بیاض ادیب:

حیف حلق تشنہ اے جو تھا نبی کا بوسہ گاہ
تس گلے اوپر چلایا شمر خنجر یا امام
در حضور تو گئے مارے ز جور کوفیاں
دو پسر تیرے علی اکبر و اصغر یا امام

(۹) مسعود حسن رضوی ادیب، "شمالی ہند..."، ص ۷۷۔

زآتش غم جل کے خاکستر ہوا ہے آسماں
کوکب و انجم ہوئے مانند اخگر یا امام (۱۰)

اس باب میں کچھ شک اب غالباً کسی کو نہ ہو کہ طرز شعر گوئی کی حیثیت سے ریختہ کی مقبولیت نے شمال میں "ہندی/ہندوی" کے فروغ میں رکاوٹ ڈالی۔ اور شمال میں خود ریختہ بطور طرز شعر گوئی کی مقبولیت کا سبب بھی یہاں فارسی کا دور دورہ، اور اس زبان سے لوگوں کا فطری شغف معلوم ہوتا ہے۔ فارسی کی طرف یہ رجحان، اوپر بیان کردہ وجوہ کے علاوہ شمال والوں کی تہذیبی نخوت، اور سبک ہندی کی شاعری کے ان کے درمیان غیر معمولی دبدبے اور ہردلعزیزی کے باعث بھی ہے۔ فارسی کی طرف جھکاؤ، اور فارسی (یا سبک ہندی) کی غیر معمولی توقیر و مقبولیت کا ایک ثبوت اس بات میں بھی ملتا ہے کہ دلی والے ایک عرصۂ دراز تک "غزل" اور "ریختہ" میں فرق کرتے رہے۔ یعنی وہ "ریختہ" میں کہی ہوئی غزل کو غزل نہیں، صرف "ریختہ" قرار دیتے تھے۔ "غزل" کی اصطلاح صرف فارسی غزل کے لیے تھی۔ چنانچہ قائم کا مشہور شعر ہے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی (۱۱)

ہم لوگ اس شعر کو کم از کم سو سوا سو برس سے مختلف باتوں کے ثبوت میں پیش کرتے آئے ہیں۔ لیکن کسی نے ٹھہر کر یہ نہ پوچھا کہ بھائی، "ریختہ" کو "غزل طور" کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا قائم کے پہلے ریختہ میں غزل نہ تھی؟ تو پھر ان کے استاد مرزا رفیع سودا، اور ان کے استاد شاہ حاتم (۱۶۹۹ تا ۱۷۸۳)، اور قائم کے دوسرے اساتذہ مثلاً شاہ ہدایت دہلوی (وفات ۱۸۰۵) اور خواجہ میر درد (۱۷۲۰ تا ۱۷۸۵) کیا لکھ رہے تھے؟ (۱۲) ظاہر ہے کہ "غزل" سے قائم کی مراد "فارسی غزل" ہے۔ ان کی اس ڈینگ کو ان کے اپنے اساتذہ خواہ بدمذاقی پر محمول کرتے، لیکن قائم کہہ یہی رہے ہیں کہ مجھ سے پہلے اردو میں سچی، فارسی کے طرز کی، غزل کسی نے کہی نہیں، سب لوگ دکنی طرز میں کمزور سی شاعری کرتے تھے، اتنی کمزور، کہ اسے غزل کا

(۱۰) ایضاً، ص ۹۵۔
(۱۱) قائم چاندپوری: "کلیات"، مرتبہ اقتدا حسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، جلد اول، ۱۹۶۵، ص ۲۱۵۔
(۱۲) قائم کا زمانۂ حیات: ۱۷۲۴ تا ۱۷۹۵۔ شعر زیر بحث کی کوئی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی، لیکن ممکن ہے کہ ۱۷۴۴ سے ۱۷۶۰ کے درمیان کہا گیا ہو۔ قائم نے اپنا تذکرہ ۱۷۴۴ سے ۱۷۵۲ کے زمانے میں مرتب کیا۔ اغلب ہے کہ انھیں دنوں ان کا سابقہ دکنی ادب سے پڑا ہو۔

نام بھی دینا مناسب نہیں۔ (واضح رہے کہ قائم کے زمانے میں "لچر" سے مراد تھی "کمزور، لچیلی"۔ (۱۳) اس لفظ کو آج "لغو، مہمل، بیہودہ؛ بے تکی بات" کے معنی میں برتتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "نوراللغات")۔ (۱۴) یہ معنی قائم کے زمانے میں موجود نہ سہی، لیکن جو معنی تھے وہ بھی کچھ کم تحقیری نہ تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ قائم کی نظر میں "غزل" کوئی اعلیٰ درجے کی چیز تھی، اور ریختہ میں جو شاعری تھی اس کے لیے "غزل" کا اعلیٰ لقب موزوں نہ تھا۔ "غزل" اور "ریختہ" کے مندرجہ بالا امتیاز میں اگر کوئی شک ہو تو مصحفی کا شعر سنیے جو معاملے کو بالکل صاف کر دیتا ہے۔ یہ شعر آٹھویں دیوان کا ہے، جو ۱۸۲۰ کے قریب مکمل ہوا ہوگا:

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل
معتقد کیوں کہ کوئی سعدی و خسرو کا ہو (۱۵)

دہلی والے ایک انداز مطلق العنانی، اور سامراجی شان کے ساتھ اردو کی بادشاہی کا دعویٰ کرتے ہیں، اور اپنے شہر کے لیے اردو کے اصل اور قدیمی دارالخلافہ کا لقب استعمال کرتے ہیں، اور اپنی زبان کو "مستند ترین" اور قاعدہ پرداز (normative) جانتے ہیں۔ لیکن تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ دہلی نے اردو کو اس کے اصل روپ (خواہ وہ خود دہلوی ہو، یا گجری، یا دکنی) میں منہ نہ لگایا۔ اٹھارویں صدی کی دہلی میں اردو مقبولیت کی منزلیں طے کرنے لگی، لیکن اس کا نام پھر بھی "ریختہ" ہی رہا۔ مناسب تو یہ تھا کہ اب اسے صرف "ہندی" کے نام سے پکارا جاتا، جو اس کا صحیح نام تھا۔ لیکن فارسی کے حق میں جانب داری، اور قدیم اردو، یعنی "دکنی/ہندی/ہندوی"، کے خلاف پرانے تعصب کے باعث، ادبی زبان کے لیے "ریختہ" (جس کے معنی کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) ہی نام رائج ہوا۔ اس تعصب کو دیکھتے ہوئے اٹھارویں صدی کے پہلے کی دلی

(۱۳) John T. Platts: *Dictionary*, OUP Edn., 1978, p. 954
اس لغت میں "لچر" کے معنی حسب ذیل درج ہیں:

Yielding, pliant, soft, weak, feeble, lacking backbone, loose, shaky, wanting force or vigour (language & c., as lachar ibarart), a soft or yielding person, a weak man, a foolish fellow, simpleton, noodle.

(۱۴) مولوی نورالحسن نیر کاکوروی: "نوراللغات"، لکھنؤ، اشاعت العلوم پریس، جلد چہارم، ۱۹۳۱، ص ۳۸۳۔
(۱۵) مصحفی، "دیوان مصحفی" (دیوان ہشتم)، پٹنہ، خدابخش لائبریری، ۱۹۹۵، ص ۵۲۔ (متن مبنی بر نسخۂ خدابخش، مرتبہ و مطبوعہ عابد رضا بیدار)۔

میں ''ہندی / ہندوی'' ادب کی کمی کچھ بھی حیرت خیز نہیں۔ بلکہ حیرت تو اس پر ہونا چاہیے کہ پھر بھی اتنا سارا ''ہندی / ہندوی'' ادب دہلی میں لکھا گیا۔

اپنے گجری / دکنی ماضی کو بھلانے، یا اس کا اثر کم کرنے کی خاطر، یا پھر اس کے خلاف دفاعی کارگذاری کے طور پر، دہلی کی ادبی تہذیب نے اپنے اندر ایک طرح کی انانیت اور رعونت پیدا کی، اور گجری / دکنی کو اپنے سے الگ، یا کمتر اور ناقابل لحاظ، قرار دینے کی رسم شروع ہی سے آغاز کر دی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رعونت اور استثناپذیری، یعنی exclusionism کا یہ رویہ دہلی والوں نے تمام غیر دہلوی اردو ادب اور زبان کے لیے بھی شروع ہی میں اختیار کر لیا۔ انشا کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ مرشد آباد اور عظیم آباد والوں، بلکہ لکھنؤ کے بھی اصل رہنے والوں، کو اردو کے معاملے میں گنوار سمجھتے تھے۔ انشا سے کچھ پہلے (یا کچھ بعد) احد علی خاں یکتا غیر دہلی والوں کو گنوار نہیں کہتے، لیکن ان کی بھی نظر میں اردو اگر مستند ہے تو محض دلی والوں کی۔ اور میر نے ان دونوں سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ریختہ کی شاعری وہی ہے جو شاہجہاں آباد کی زبان میں ہو۔

رعونت اور استثناپذیری کا رویہ دہلی کی ادبی اور لسانی تہذیب میں بیسویں صدی تک بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں تو یہ حال تھا کہ خود دہلی کا وہ ادب، جو ''غزل'' کے معیاروں سے ''فروتر'' دکھائی دیتا ہے (مثلاً روشن علی اور اسمٰعیل امروہوی کے جنگ نامے) اس کا ذکر اہل دہلی نے اپنے تذکروں میں نہ کیا۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اپنے پرانے سرمائے سے اہل اردو کی پہلو تہی کا باعث انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب و تصورات سے ان کا شغف ہے۔ شیرانی لکھتے ہیں:

> میں اگرچہ اردو کے میدان میں دکن کی ادبی و تالیفی تحریکات کی اولیت کے دعوے کو تسلیم کرتا ہوں، تاہم یہ بھی کہتا ہوں کہ اردو شاعری ہندوستان کے ہر صوبے میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھی۔ یہ اور بحث ہے کہ آیا وہ بھاشا کی متبع تھی یا فارسی کی۔۔۔ لیکن ملک کے ہر صوبے میں اردو میں رسائل لکھے جانے کا رواج تھا۔۔۔ لیکن آج یہ حصۂ ادب ہماری نظروں سے کیوں نہیں گذرتا؟ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری وہی ناقابل معافی بے پروائی ہے۔۔۔ شیکسپیئر اور ملٹن، گولڈ اسمتھ اور ٹینی سن کی آندھیوں نے ہمیں اندھا کر دیا ہے۔۔۔ انگریزی اور انگریز پرستی کی لہر ہم میں اس قدر دوڑ گئی ہے کہ ہم اپنے وطن کی ہر شے سے نہ صرف احتراز کرتے ہیں بلکہ نفرت کرنے لگے ہیں۔(۱۶)

حافظ صاحب کا یہ ارشاد ''آب حیات'' اور اس کے بعد کی تمام انیسویں صدی، اور بیسویں صدی کے نصفِ اول تک کی اکثر تنقیدی تحریروں پر صادق آتا ہے۔ لیکن معاملہ صرف انگریز پرستی کا نہیں، دہلی پرستی (اور پھر لکھنؤ پرستی) کا بھی ہے۔ اس کو دہلی / لکھنؤ والوں نے خود رائج کیا، اور لطف یہ ہے کہ باقی اہل اردو نے بھی اسی درگاہ پر ہنسی خوشی ماتھا ٹیکنا واجب جانا۔ (یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر انشا اور احد علی خاں یکتا جیسے مصنف نہ ہوتے، اور لکھنؤ کا اولین ادب تقریباً سارے کا سارا دہلی ہی والوں نے نہ پیدا کیا ہوتا، تو یار لوگ لکھنؤ کی قاعدہ پرداز حیثیت کو تسلیم کرتے بھی کہ نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان اس لیے قابل استناد مانی گئی کہ وہ اصلاً دہلی ہی کی تھی ـــ یا اگر نہیں بھی تھی تو فرض کر لی گئی تھی۔ یہ اور بات کہ بعد کو لکھنؤ والوں نے بھی پر پرزے نکالے اور اپنی زبان کو دہلی سے الگ قائم کیا)۔

انگریزوں کے استیلا کے بہت پہلے ہمارے یہاں کی ادبی تہذیب پر دہلوی سامراج قائم ہو چکا تھا۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر کہا، خود وہ دہلی والے، یا شمال والے، جو ''غزل'' کے معیار پر پورے نہ اترتے تھے، ادب کی محفل میں داخلہ پانے سے محروم رکھے گئے۔ بہت ہی کم تذکرے ایسے ہیں جن میں افضل یا جعفر زٹلی کا محض ذکر ہو، تفصیلی ترجمہ اور نمونۂ کلام تو بعد کی بات ہے۔ اردو ادب کے جدید مورخ بمشکل ہی ان کا نام لیتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، افضل کو یونیورسٹیوں اور اعلیٰ درس گاہوں میں بار نہیں۔ اور میر جعفر زٹلی کا نام کبھی کبھی لیا بھی جاتا ہے تو ڈرتے ڈرتے، اور ناپسندیدگی کے ساتھ، دبی زبان سے۔

مثال کے طور پر، رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۷ میں انگریزی میں ایک تاریخ ادب اردو لکھی۔ یہ بہت بااثر ثابت ہوئی، اور اس کا اردو ترجمہ (مترجم مرزا محمد عسکری) اور بھی مقبول ہوا۔ اس میں افضل کا نام نہیں، اور زٹلی کو ''مسخرے'' شعرا کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔ ان کی کچھ تفصیل درج نہیں۔(۱۷) حامد حسن قادری نے اپنی ضخیم ''داستان تاریخ اردو'' میں افضل پر ایک مختصر عبارت لکھی ہے، لیکن اس میں کئی اغلاط ہیں۔ زٹلی پر انھوں نے کوئی صفحہ بھر لکھا ہے، لیکن ان کی بھی نظر میں زٹلی ایک غیر اہم، مسخرہ نما شخصیت ہیں۔(۱۸) محمد صادق نے اپنی انگریزی تاریخ میں ان دونوں کا نام تک نہیں لیا ہے۔ این میری شمل کو افضل

---

(۱۶) محمود شیرانی، ''مقالات''، جلد دوم، ص ص ۹۶ تا ۹۷۔

(۱۷) رام بابو سکسینہ: *A History of Urdu Literature* جو متن میں استعمال کر رہا ہوں وہ مرزا محمد عسکری کا اردو ترجمہ ہے۔ لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۴۱۔ زٹلی کا بیان اس کتاب میں ص ۲۰۹ پر ہے۔

(۱۸) حامد حسن قادری: ''داستان تاریخ اردو''، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ (اول اشاعت ۱۹۴۱)، ص ص ۲۳ تا ۳۳

سے کوئی سروکار نہیں، لیکن انھوں نے سماجی طنز نگار کی حیثیت سے زٹلی کو کچھ اہمیت ضرور دی ہے۔(۱۹) علی جواد زیدی نے البتہ دونوں کا ذکر لکھا ہے، اگرچہ مختصر۔ اور انھیں ان شعرا کی ادبی یا لسانی اہمیت کا کوئی خاص احساس نہیں معلوم ہوتا۔ پھر بھی، انگریزی زبان میں لکھی گئی اردو ادب کی تاریخوں میں زیدی کی تاریخ، افضل اور زٹلی دونوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے کلام کرتی ہے۔(۲۰) ان دنوں ہر چھوٹے بڑے ادیب پر تحقیقی مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ معمولی معمولی لوگوں پر متعدد کتابیں اور مقالے سپرد قلم ہو رہے ہیں، لیکن جعفر زٹلی پر اب تک صرف ایک پی ایچ ڈی مقالہ لکھا گیا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی کتاب شاید نہیں ہے۔(۲۱) افضل کے بارے میں صرف دو سر برآوردہ لوگوں کی تحریریں ہیں، لیکن وہ دونوں دراصل "بکٹ کہانی" کے ایڈیشن ہیں۔(۲۲)

ہمیں جمیل جالبی اور گیان چند / سیدہ جعفر کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی تاریخ اردو ادب میں افضل اور جعفر زٹلی کو معتد بہ صفحات دیے گئے ہیں، اگرچہ ان دونوں ہی میں تنقیدی تجزیہ کافی و وافی نہیں ہے۔ جمیل جالبی نے "بکٹ کہانی" کو نظر استحسان سے دیکھا ہے، لیکن اردو ادب کے ایوان عظمت میں اس کے لیے انھوں نے کوئی جگہ متعین نہیں کی۔ زٹلی کے بارے میں ان کا رویہ بنیادی طور پر وہی ہے جو این میری شمل کا ہے۔ گیان چند نے اپنی تمام تر توجہ افضل کی "اصل" شخصیت کا سراغ لگانے پر صرف کی ہے، اور ان کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں وہ کم و بیش چپ ہیں۔ زٹلی کی حیات اور ان کی زبان پر انھوں نے ایک مختصر مقالہ سا لکھ ڈالا ہے، لیکن زٹلی بطور شاعر کے بارے میں انھیں کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ وہ ان کی "فحاشی" سے نالاں لگتے ہیں۔(۲۳)

---

(۱۹) Annemarie Schimmel: *Classical Urdu Literature from the Beginning to Iqbal,* scicle three of Vol. VIII of Jan Gonda's *A History of Indian Literature,* Wiesbaden, 1975, p.157.

(۲۰) علی جواد زیدی: *A History of Urdu Literature*, New Delhi, Sahitya Academy, 1993, pp 67-68, 119-120

(۲۱) جعفر زٹلی کا صرف ایک جدید ایڈیشن ہے، نعیم احمد: "کلیات جعفر زٹلی"، علی گڈھ، ادبی اکیڈمی، ۱۹۷۹۔ اس کا دیباچہ ذرا بچکانہ ہے، لیکن نعیم احمد اس بات کے لیے تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے متن میں نہ تحریف کی ہے، نہ نقطے لگائے ہیں۔

(۲۲) پہلا متن تو محمود شیرانی کا قائم کردہ ہے، "مقالات"، جلد دوم، ص ص ۹۵ تا ۱۱۶۔ مضمون کی شکل میں یہ ۱۹۲۶ میں چھپا تھا۔ اس کے بعد مسعود حسین اور نور الحسن ہاشمی نے اسے "قدیم اردو"، نمبر ا، حیدر آباد، عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۶۵ کی شکل میں نکالا۔ یہی متن یوپی اردو اکیڈمی نے ۱۹۷۹ میں شائع کیا۔

(۲۳) افضل کے لیے دیکھیں، جمیل جالبی، "تاریخ"، جلد اول، ص ص ۶۲ تا ۶۷۔ زٹلی کے لیے، جالبی، "تاریخ"، جلد دوم، حصہ دوم، ص ص ۹۱ تا ۱۱۵۔ مزید ملاحظہ ہو: گیان چند اور سیدہ جعفر، "تاریخ"، جلد پنجم، ص ص ۱۰

(بقیہ اگلے صفحے پر)

حقیقت یہ ہے کہ افضل اور زٹلی دونوں ہی بڑے شاعر ہیں۔ علاوہ بریں، افضل اردو میں بارہ ماسہ کے بھی موجد ہیں۔ سب سے پہلا بارہ ماسہ مسعود سعد سلمان نے لکھا، اور ان کے بعد غالباً افضل نے۔ اردو میں وہ بہر حال پہلے ہیں۔ افضل کی شاعری کا اعتراف میر حسن نے کیا ہے، لیکن بہت اختصار سے۔ میر حسن لکھتے ہیں:

> محمد افضل، افضل تخلص، دور قدیم کے ہیں۔ گوپال نام کوئی ہندو بچہ تھا، اس پر عاشق ہو کر اپنے حسب حال ایک بارہ ماسہ عرف "بکٹ کہانی" لکھا۔ اکثر کھتری، اور گانے والیاں اس کی شائق ہیں۔ [کلام میں] نصف فارسی رکھتے ہیں اور نصف ہندی، لیکن قبولیت، داد الٰہی ہے۔ [ان کا کلام] دلوں پر اثر کرتا ہے۔(۲۴)

میر حسن کے ارشادات میں ناپسندیدگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ افضل کا طرز ریختہ تھا، اور وہ میر حسن کے وقت میں نامنظور اور متروک ہو چکا تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میر حسن کے خیال میں "بکٹ کہانی" میں ذاتی سوانح تھے، اور یہ کچھ اچھی بات شاید نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ میر حسن نے یہ کہہ دیا کہ اس نظم کے شائقین "کھتری لوگ، اور گائنیں" ہیں، جو کسی اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک شاید نہ ہو سکتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر تذکرۂ میر حسن میں شمولیت بھی افضل کے لیے کچھ خاص مفید ثابت نہ ہوئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی نظم میں خود نوشت کا کوئی عنصر نہیں۔ اس کی متکلم ایک عورت ہے، اور وہ واحد متکلم کے صیغے میں اپنے ہجر و فراق کی داستان موسموں کے گذران کے پس منظر میں بیان کرتی ہے۔ "بکٹ کہانی" میں استعاراتی پیچیدگی بہت نہیں ہے، لیکن اس میں انواع و اقسام کے پیکر اور حسی تشبیہیں کثرت سے ہیں۔ نظم بے حد رواں ہے، اور اس میں اس طرح کا ابلتا ہوا لیکن پر از تمکین جوش و شوق ہے جو اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری کا خاصہ کہا جا سکتا ہے۔

جعفر زٹلی کو بہ آسانی اردو کا سب سے بڑا طنز نگار کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں، کیوں

تا ۳۴ (افضل)، اور ص ص ۵۷ تا ۷۳ (زٹلی)۔

حصہ دوم، ص ص ۹۱ تا ۱۱۵۔ مزید ملاحظہ ہو: گیان چند اور سیدہ جعفر، "تاریخ"، جلد پنجم، ص ص ۱۰ تا ۳۴ (افضل)، اور ص ص ۵۷ تا ۷۳ (زٹلی)۔

(۲۴) میر حسن: "تذکرۂ شعرا"، (۱۷۷۴/۱۷۷۸)، مرتبہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علی گڈھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۱، ص ۴۱۔ میر حسن کے علاوہ، اٹھارویں صدی کے تذکرہ نویسوں میں صرف قائم نے افضل کا نام لیا ہے۔

کہ اردو میں اعلیٰ درجے کی طنزیہ نظم و نثر کی کمی نہیں ہے۔ لیکن زٹلی محض طنز نگار نہیں ہیں۔ وہ الفاظ کے پارکھ اور شائق بھی ہیں۔ ان کے مختصر کلیات میں جتنے تازہ الفاظ ہیں (فحشیات کو نظر انداز کر دیں تب بھی) اتنی تعداد میں تازہ الفاظ ان کے کلیات کا دو گنا حجم رکھنے والے شاعر کے کلام میں بھی نہ ہوں گے۔ انھیں "سخت" اور "نرم" دونوں طرح کی فحاشی سے شغف ہے، لیکن وہ اس معنی میں فحش گو نہیں جس معنی میں (مثلاً) صاحب قراں، یا عریاں فحش گو ہیں۔ صاحب قراں کے کلام میں (اور عریاں کے یہاں اور بھی زیادہ) فحاشی کا مقصد سستے قسم کا جنسی تلذذ اور ہوس ناکی کا لطف پیدا کرنا ہے۔ اس کے برخلاف، زٹلی کی بہت ساری فحاشی ایک طریقہ ہے غصے، ناپسندیدگی اور برہمی کے اظہار کا۔ کچھ فحاشی ان کی اپنی واماندگی حال کے بیان میں کام آتی ہے۔ کچھ ایسی ہے جہاں وہ اپنی طبیعت کی جولانی دکھاتے ہیں۔ اس ساری فحاشی میں جنسی چٹخارا برائے نام ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ لگتا ہے کہ انھیں جنسی افعال و اعمال سے نفرت ہے۔ مجموعی طور پر وہ اپنے تقریباً ہم عصر انگریز فحش گو طنز نگار جان ولمٹ (۱۶۴۷ تا ۱۶۸۰) (John Wilmot, Earl of Rochester) کی یاد دلاتے ہیں۔ راچسٹر ہی کی طرح زٹلی کو انداز اور تکنیک کے تنوع پر حیرت انگیز مہارت ہے، اور وہ زندگی اور سیاست دونوں کے بہت سنجیدہ مبصر ہیں۔ وہ اپنی نثر میں اورنگ زیب پر انتہائی سخت، بلکہ دل آزار طنز کرتے ہیں تو اس کا مرثیہ اور جنگ نامہ بھی لکھتے ہیں، اور ایسا کہ جس میں اورنگ زیب کی موت کے بعد آنے والے انتشار اور زوال کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے۔

لسانی اعتبار سے افضل اور زٹلی دونوں اہم ہیں۔ ان کی زبان سے پتا لگتا ہے کہ اردو اب ریختہ کے ذرا خام (اور آخری تجزیے میں غیر موثر) اسلوب سے باہر نکل کر ایک تقریباً کامل و اکمل ذریعۂ اظہار بن جانے کی طرف گامزن ہے، اور یہ وہ ذریعۂ اظہار تھا جو زٹلی کی موت (۱۷۱۳) کی تین چار دہائیوں کے بعد ہی دہلی کی ادبی تہذیب پر پوری طرح چھا گیا۔ زٹلی کی لفظیات کو تنوع اور وسعت دونوں لحاظ سے افضل کی لفظیات پر تفوق ہے۔ ان کی ادبی زندگی اردو ادب کی تاریخ میں بہت بڑے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اور صرف شمال ہی میں نہیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں جو مہارتیں اردو شعرا نے بہم پہنچائی تھیں، شاید وہ سب زٹلی کی دسترس میں نہ رہی ہوں گی۔ اور گجری / دکنی میں طنز و مزاح کا کوئی خاص سرمایہ بھی نہیں (اگر شعرا کی چھوٹی موٹی نوک جھونکوں کو نظر انداز کر دیں تو کچھ بھی نہیں)۔ اغلب ہے کہ زٹلی نے فارسی کے عظیم پیش رووں، خاص کر فوقی یزدی سے سیکھا ہوگا۔ فوقی عہد اکبری میں ہندوستان بھی آیا تھا۔ ٹیک چند بہار نے "بہار عجم" میں اس کے اشعار خاصی تعداد میں سنداً درج کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فوقی کا کلام دہلی میں متداول رہا ہوگا۔ فوقی اور زٹلی دونوں کے یہاں فحش کی طرف رجحان عام طور پر محض

برائے فحش نہیں ہے۔

گجری اور دکنی کے مقابلے میں افضل اور زٹلی دونوں کی زبان آج کے شمالی سامع کو بہت کم اجنبی لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے تت سم الفاظ، تیلگو، مراٹھی، یا گجراتی لفظ بہت کم ہیں۔ اور ان کی زبان کا فارسی عنصر بہر حال نمایاں اور مانوس ہے۔ اس کا اودھی اور برج (اور تھوڑا بہت پوربی) عنصر کچھ کم مانوس ہے، لیکن وہ دکنی یا گجری کے اغلاق کا حکم پھر بھی نہیں رکھتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ زٹلی اور افضل کی لفظیات کا قابل لحاظ حصہ اٹھارویں صدی کے بزرگ شعرا کے یہاں باقی رہا۔ عصر حاضر کی دہلوی / لکھنوی اردو میں یہ الفاظ خال خال ہیں، لیکن مشرقی اردو میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اور دہلی / لکھنؤ کی یہ "متروک" لفظیات دکن والوں کے لیے بھی اجنبی نہیں ہیں۔ اور خود دکنی بھی اٹھارویں صدی کی دہلی میں بہت زیادہ "غیر ملکی" نہ رہی ہوگی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ سودا نے سترہ اشعار کی ایک رثائی نظم "بزبان دکھنی آمیز" بھی لکھی ہے۔ (۲۵) اور دوسرا ثبوت یہ کہ سودا اور میر کے یہاں دکنی استعمالات (یا وہ استعمالات جنھیں ہم مختص بہ دکنی سمجھتے ہیں) اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اور اس کے برعکس بھی ہے۔ یعنی بہت سے استعمالات جنھیں سودا، میر، حاتم وغیرہ سے مخصوص گمان کیا جاتا ہے، دکنی میں بھی ہیں۔

اس بات سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ "سخت" دکنی عنصر کو چھوڑ کر سترہویں صدی کی اردو ہر جگہ کم و بیش یکساں تھی۔ مرور ایام کے ساتھ دہلی کی زبان زیادہ بدلی، دکن اور پورب کی کم۔ اس اشتراک ہی کے باعث قبل ۱۷۵۰ کے دہلی والوں میں دکنی کے خلاف تعصب میں وہ سختی نظر نہیں آتی جو میر کے "نکات الشعرا" میں نمایاں ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سترہویں صدی میں اگر "فصیح" زبان کا کوئی معیار تھا تو وہ دکن ہی میں تھا۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وجہی نے اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں مبتدیوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ ایسے الفاظ نہ برتیں جنھیں استاد کے استعمال کے ذریعے صحت اور فصاحت کی سند نہ مل چکی ہو۔

سترہویں صدی کا وسط آتے آتے فارسی میں ہر جگہ، حتیٰ کہ ایران اور ترکی میں بھی، سبک ہندی کا بول بالا ہو چکا تھا۔ شمال میں ہند + مسلم ادبی فکر پر سنسکرت، برج، اور اودھی کے اثر کا سلسلہ چودھویں صدی میں شروع ہو گیا تھا، اور اکبر کا زمانہ آتے آتے اس کی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۶۴۰ کی دہائی میں ہم پنڈت راج جگن ناتھ کو شاہجہاں کے دربار میں دیکھتے ہیں۔ جگن ناتھ کی سنسکرت شاعری پر سبک ہندی کے اثرات کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اور جیسا کہ شیلڈن پالک (Sheldon Pollock) نے لکھا ہے،

(۲۵) سودا: "کلیات"، مرتبہ عبد الباری آسی، جلد دوم، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۳۲، ص، ص ۲۴۵ تا ۲۴۶۔

سنسکرت شاعری کے ذکی الحس طالب علم کو سبک ہندی کی شاعری میں سنسکرت کی جھلک بھی صاف نظر آسکتی ہے۔

اگر فارسی کی مقبولیت اور رتبۂ اعلیٰ نے شمال میں ہندی / ریختہ کی شاعری کو پھلنے پھولنے سے روکا تو یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ ۱۷۰۰ کے زمانے میں، جب دہلی میں اردو کا بول بالا ہونے لگا تو سبک ہندی کے اثر اور مثال نے اس نئے، جاندار اور ابتہاج انگیز اسلوب کو فروغ دینے میں بہت مدد کی جسے ولی نے دکن سے لا کر دلی میں متعارف کیا تھا۔ شاہ مبارک آبرو (۱۶۸۳/۱۶۸۵ تا ۱۷۳۳) نئی صدی کے پہلے بڑے شاعر ہیں۔ ممکن ہے نواب صدرالدین فائز (۱۶۹۰ تا ۱۷۳۷/۱۷۳۸) نے اپنا اردو دیوان پہلے مرتب کیا ہو، لیکن وہ شخص جس کے کلام میں استادی کے انداز بوجہ احسن جلوہ گر نظر آتے ہیں، آبرو ہی ہیں۔ انھوں نے سترہویں صدی کے آخری دو ایک برس میں شعر گوئی شروع کی ہو گی، اور انھوں نے ایہام گوئی بھی بہت نوعمری میں اختیار کر لی ہو گی، کیوں کہ غزل میں ان کا سارا کلام اسی رنگ کا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خسرو نے اس بات پر فخر کیا تھا کہ میں نے "ایہام ذوی الوجوہ" ایجاد کیا ہے۔ خسرو کا اثر اٹھارویں صدی کے دہلوی شعرا پر یقیناً تھا۔ وہ انھیں اپنا پیش رو مانتے تھے۔ لیکن ایہام کے سلسلے میں ان شعرا پر فوری اثر سنسکرت، براہ برج بھاشا، کا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی، جو اردو شاعری کی "ایرانیت" کے شاکی ہیں، اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو شاعری (یعنی ولی کی اردو شاعری) میں ایہام کا سرچشمہ سنسکرت ہی رہا ہو گا۔(۲۶)

آبرو، بلکہ یوں کہیں کہ وہ تمام لوگ جنھوں نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہندی / ریختہ / دکنی میں شاعری کا کاروبار شروع کیا، ولی (۱۶۶۵/۱۶۶۷ تا ۱۷۰۸) کے حیطۂ اثر میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور کئی اعتبار سے ولی اٹھارویں صدی کے ربع اول سے لے کر آج تک کے سب اردو شعرا کے لیے شاعر الشعرا (Poets' poet) کا حکم رکھتے ہیں۔

(۲۶) محمد حسین آزاد، "آب حیات"، ص ۹۹۔ ملحوظ رہے کہ آبرو کا وطن آگرہ تھا، اور آگرہ برج کے علاقوں میں بہت اہم ہے۔

باب ششم

ولی نام کا اک شخص

۱۹۶۶ میں لگائے گئے ایک تخمینے کے مطابق اس وقت دیوان ولی کے ۶۵ نسخے ایسے موجود تھے جن میں تاریخ کتابت درج تھی۔ اور ۵۳ ایسے تھے جن میں تاریخ کتابت نہ تھی۔ ان کے علاوہ، ۱۳۳ ایسی مخطوطہ بیاضیں موجود تھیں جن میں ولی کے کلام کا معتدبہ انتخاب درج تھا۔ نورالحسن ہاشمی، جو ہمارے زمانے کے سربرآوردہ ماہر ولی ہیں، کہتے ہیں کہ نسخوں اور بیاضوں کی یہ تعداد اگرچہ حیرت خیز ہے، لیکن مکمل پھر بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، متذکرہ بالا فہرست میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری کے ایک ہی نسخے کا ذکر ہے، جب کہ وہاں دو ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں چار ہیں، رضا لائبریری رام پور میں دو ہیں، اور یوپی کی ریاستی آرکائیوز لائبریری، الہ آباد، میں بھی ایک ہے۔ متذکرہ بالا فہرست ان نسخ کا احاطہ نہیں کرتی۔ خود نورالحسن ہاشمی کے پاس تین نسخے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذاتی کتب خانوں میں اور بھی ہوں گے۔ (شمیم حنفی نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس بھی ایک انتہائی خوبصورت نسخہ ہے)۔ اس طرح سچ پوچھیں تو دیوان ولی کے مخطوطوں، اور بیاضوں کی مفصل وضاحتی فہرست کے لیے ایک کتاب درکار ہو گی۔(۱)

ولی کی پیدائش غالباً ۱۶۶۵/۱۶۶۷ کی ہے، اور ان کا انتقال اغلباً ۱۷۰۷/۱۷۰۸ میں ہوا۔ ان کے انتقال کی تاریخیں ۱۷۲۰/۱۷۲۵، حتیٰ کہ ۱۷۳۵ تک تجویز کی گئی ہیں۔ لیکن ولی کی تاریخ وفات کا تعین ادبی تاریخ سے زیادہ ادبی سیاست کا معاملہ ہے۔ دہلی والوں (اور ان کے زیر اثر اردو ادب کے زیادہ تر مورخین) کے لیے ولی کے انتقال کی تاریخ وہی بہتر ہے جو ۱۷۰۰ کے بہت بعد کی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ولی دکنی: "کلیات ولی"، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ (اول اشاعت ۱۹۴۵)، ص ص ۱۳ تا ۱۴۔ ولی کے مخطوطات کی فہرست محمد اکرام چغتائی نے "اردو"، کراچی کی اشاعت بابت جولائی-اکتوبر ۱۹۶۶ میں شائع کی تھی۔